سنہرا پانی

''اماں! شاید میرے عقل داڑھ نکل رہی ہے۔'' اس نے داہنے رخسار پر ہتھیلی جما کر کہا۔

''اے ہاں اب اس لوٹھا کو عقل آئے گی۔'' اماں کے بجائے دادی جان نے جزدان میں کھونپ بھرتے ہوئے ناگواری سے بڑبڑا کر کہا۔

''جس کو باقاعدہ ٹریننگ سے عقل نہ آئی اسے ''داڑھوں'' سے عقل آئے گی؟'' غسل خانے سے نکلتے بھائی میاں نے تولیے سے سر رگڑتے ہوئے تمسخرانہ کہا۔

تب اس کے صبیح ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

''کسی کے دکھ تکلیف کا احساس ہی نہیں۔ جھاڑیں مارنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں سب۔ ٹھیک ہے میں کم عقل ہوں۔ اس گھر میں جن کے پاس ''عقلیں'' ہیں وہ کیا ملکہ الزبتھ کے دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ کوئی سپروائزر، کوئی کلرک۔ ہونہہ!''

''اُوئی۔'' اس کی سسکی نکل گئی۔ ہونہہ کہہ کر سر جھٹکا تو تکلیف بڑھ گئی۔

''ڈاکٹر کے پاس چلی جانا۔'' اماں کو ذرا احساس ہوا۔

''رخسانہ کے ساتھ چلی جانا۔'' انھوں نے پھر کہا اور پوچھا۔ ''کیا تکلیف زیادہ ہو رہی ہے؟''

''نہیں، بن رہی ہوں۔ وہ دھپ دھپ کرتی..... اندر چلی گئی۔ آج تکلیف کی وجہ سے اس کی خوش مزاجی بھی غائب تھی۔ وگرنہ بڑی سے بڑی بات پر ہنستی رہتی تھی۔

''اے دلہن! سر پر چڑھنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اس سے چھوٹی دو بچوں کی ماں ہے۔ نامراد کو کون پوچھے گا؟ مجھے تو ہول آتا ہے سوچ سوچ کر۔ کسی چیز میں تو طریقہ سلیقہ ہو۔''

''کیا کروں پھر اماں؟ اور بچیوں کو کون سا میں نے مار مار کر سکھایا ہے مگر کتنی سگھڑ ہیں۔ اسے تو خود ہی کوئی شوق نہیں۔'' اماں نے بے چارگی سے جواب دیا۔

''بس کھی کھی آتی ہے یا کھانا اور سونا اور دودھ ضرور ملے نواب زادی کو..... اب دیکھو

چوبیس کا سن لگ گیا۔ اس خالی کے چاند میں۔ مجھے تو اچھی طرح یاد ہے۔ سورج سوا نیزے پر تھا۔ پتے سوکھ رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کا کوئی منتقم بدلہ لینے کی خاطر دشمن پر بمباری کر رہا تھا۔''

''البتہ بھینسیں دودھ خوب دے رہی تھیں۔'' چھوٹے بھائی صاحب یونیورسٹی سے وارد ہو کر دادی جان کی بات میں مخل ہوئے۔

تو بھائی میاں نے بلند قہقہہ لگایا۔ وہ اندر کمرے میں سُلگ کر رہ گئی۔

''ہونہہ! ابھی تو ابا جی کما رہے ہیں۔ دودھ۔ دودھ جیسے انھوں میرے لیے بھینسیں پال رکھی ہیں۔ طعنے ایسے دیتے ہیں۔ جیسے ان کا کھا رہی ہوں۔ جسے دیکھو میرے کھانے پینے پر نظریں لگائے بیٹھا ہے۔ ہزار بار پیوں گی دودھ۔ جلنے والے جلا کریں۔'' اس نے خود کو دلاسہ دیا۔

.....

رخسانہ باجی میکے آئی ہوئی تھیں۔ شام کو وہ خوبصورت چادر پہن کر کھڑی ہو گئی۔

''چلو رخسانہ باجی! ڈاکٹر کے پاس۔''

''کیوں بھئی۔ تمھیں کیا ہوا؟ انھوں نے حیرت سے اس کے صحت مند گلابی چہرے کو دیکھا۔

''درد ہو رہا ہے داڑھ میں۔''

''اچھا، میں منّو کو دودھ پلا آؤں۔ سو جائے گا۔'' وہ باہر نکل گئیں۔

''اچھا تو ہمارے بھی دن پھرنے والے ہیں۔'' چھوٹے بھائی نے اندر داخل ہو کر پوچھا۔ ''سنا ہے تمھارے اپر چیمبر میں عقل نامی مہمان آ رہے ہیں؟''

''آپ سے مطلب؟'' وہ چڑ کر بولی۔

''ہاں بھئی، ہم سے کیوں مطلب نہیں۔''

''دیکھیں چھوٹے بھائی! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ میں ویسے ہی مر رہی ہوں۔''

''ارے، اتنی خوفزدہ مت ہو۔ بڑی اعلیٰ چیز ہوتی ہیں عقل محترمہ۔ مایوسی کی باتیں مت کرو۔ نیک فال ہے تمھارے حق میں۔'' وہ اس کے بستر پر لیٹ گئے۔

''سارا گھر دشمن ہے میرا۔'' وہ باہر چلی گئی۔

.....

رخسانہ باجی تو معہ سگھڑاپے کے عرصہ ہوا سسرال سدھار چکی تھیں۔ اس سے چھوٹی

نغمانہ بچپن ہی سے ماموں زاد سے منسوب تھی۔ اٹھارویں برس میں لگی ہی تھی کہ شادی کے تقاضے شروع ہو گئے۔

ابا جی پہلے آشیانہ کا بیاہ کرنا چاہتے تھے مگر بقول اماں کسی ڈھنگ کے آدمی نے اس کے لیے سوال ہی نہیں کیا تھا آج تک۔ وہ بھی بڑا عرصہ بھائی کو ٹالتی رہیں مگر کب تک؟

خاندان کی خواتین زیادہ ہی ''سگھڑاپا پسند'' تھیں اور ابا جی کے خاندان کے افراد ان کے گھر کے ذرا ذرا سے حال سے واقف تھے۔ ایک تو اس کا لا اُبالی پن، اس پر مستزاد اس کا منہ پھاڑ کر جواب دینا۔ شکل وصورت میں خاندان کی سب ہی لڑکیاں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ اس پر اس کے اپنے دماغ بہت اونچے تھے۔ آج تک اسے کوئی بھایا ہی نہیں تھا۔ اپنے قابل ہی نہ لگا تھا۔

انٹر کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر چند سال بعد سخت بوریت ہوئی تو بے اندازہ ضد کر کے مقامی کالج میں داخلہ لے لیا۔ اماں اور دادی جان سخت خلاف تھیں اس کے دوبارہ کالج جانے کے، ان کے خیال میں اب اسے گھریلو امور میں طاق ہو جانا چاہیے تھا۔

''ہونہہ، جو طاق ہیں وہ کیا کر رہی ہیں۔'' وہ اسی لا اُبالی پن کا مظاہرہ کرتی۔ ''بچے سُلا رہی ہیں بچے کھلا رہی ہیں۔ نہ اپنی نیند سونا نہ اپنی نیند جاگنا۔''

''بس اس نامراد کو تو اس کی نیند لے ڈوبے گی۔'' دادی جان کُڑھ کر کہتیں۔ ''کالج جانے سے آدھ گھنٹہ پہلے اٹھتی ہے۔ کالج سے آ کر کھانا کھا کر پھر سو جاتی ہے دیکھو تو ذرا، کوئی ذرا سی بچی ہو تو کہا جائے۔ اس کا اُٹھان دیکھو، اس کی حرکتیں دیکھو۔''

تب وہ کھلکھلا اٹھتی۔ ''جو چاہے دیکھو بغیر ٹکٹ دیکھو۔'' وہ ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر گنگناتی۔

چل ہٹ پرے۔ تو تو اماں باوا کا نام ہی ڈبو کر رہے گی۔'' وہ مسکراہٹ دبائے مصنوعی برہمی سے بولتیں۔

نغمی شام کو گھر آئی تو بتایا کہ وہ خصوصی طور سے آئی ہے کل کوئی لڑکے والے اسے دیکھنے آ رہے ہیں۔

''کرتا کیا ہے وہ؟'' اس نے بغیر شرمائے پوچھا۔

''یہ تو کل ہی پتہ چلے گا کیونکہ ان لوگوں سے ابھی کھل کر بات نہیں ہوئی۔''

''اچھا تو یہ آدھی باتیں مجھ سے نہ کرو۔ کوئی بات بتایا کرو تو پوری معلومات سے۔'' وہ بولی۔

''ہاں، آپا! اب آپ کی شادی ہو جانی چاہیے۔ خدا کرے کوئی بات بن جائے۔''

''اے نغمی! تو تو اس گھر سے چلی گئی ہے۔ تجھے کیوں بری لگتی ہوں میں؟'' اس نے رسالے پر سے نظریں اٹھائے بغیر سوال کیا۔

''توبہ آپا! اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے۔ ساری دنیا کی لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں۔ سب مجھ سے پوچھتے ہیں۔ تم بڑی بہن کی شادی کیوں نہیں کرتے؟ کیا عیب ہے؟ کیوں بیٹھی ہے؟''

''تو کیا سب کھڑے ہوئے ہیں جو میرے بیٹھنے پر اعتراض ہے۔'' وہ کھلکھلائی۔

حسب عادت۔

نغمی چپ ہو کر رہ گئی۔

.....

''بس کہہ دیا کوئی ضرورت نہیں سوچ بچار کی صاف ''نہیں'' کہہ دیں۔''

''کیا کمی ہے مجھ میں؟'' وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ رنگت سے ملتا گلابی شلوار سوٹ گلے میں پڑا کالا دوپٹہ بجلی کی طرح کوندتا قامت۔ ڈھیلی ڈھالی چوٹی۔ غصے سے پھڑکتی حسین و مغرور ناک۔

''ہونہہ! اتنی کم تنخواہ۔ اسے کیا اپنی اوقات کی لڑکیاں نہیں ملیں جو وہ لوگ اس دیدہ دلیری سے میرے لیے چلے آئے ہیں۔ ان سے یہ تو کہہ دیتیں شکل دیکھی ہے۔''

''اے تو کیا کوہِ قاف کا شہزادہ بیاہنے کا وعدہ کر گیا ہے؟'' اماں اس کی بات سن چکی تھیں اتنے صفاچٹ انکار پر بڑی طرح کھول رہی تھیں۔

''ویسے اماں! کوہ قاف کے ''دیو'' زیادہ مشہور ہیں اگر وہاں کے شہزادے کے بارے میں سنا ہے تو وہ یہ کہ پتھر کا ہوتا ہے۔'' رخسانہ نے اسے شرارت سے دیکھ کر کہا۔

بھائی میاں! چھوٹے بھائی اور ابا جی کوئی بھی اس رشتے پر راضی نہیں تھا کیونکہ وہ لوگ ذہنی طور پر انتہائی پسماندہ نظر آتے تھے۔ مگر اماں اور دادی زمانے کی باتوں سے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ نظر آتی تھیں اور کچھ رضامندی تھیں مگر اس کا واضح انکار انھیں مجبور کر گیا۔

رشتے آتے رہے۔ وہ ہر مرتبہ جھنجھلا اٹھتی۔ ''یا اللہ! یہ معمولی قسم کے ملازمین میرے لیے ہی رہ گئے ہیں۔''

''اگر میرے ملک میں ان سب کو حکومت کی طرف سے کار کوٹھیاں دی جاتیں تو ان میں سے کوئی بھی مجھے منظور ہوتا۔''

''تو گویا پیارا سا ایک بنگلہ ہو۔ بنگلے میں گاڑی ہو۔ گاڑی میں میرے سنگ سیاں اناڑی ہو۔'' نغمی ہنسی۔

''ارے چھوڑو، نغمی! دونوں ہی اناڑی ہو گئے۔ تو۔ خدا ہی حافظ ہوگا ان کے گھر کا۔'' چھوٹے بھائی نے چھیڑا۔

''ہم تو ایسے ہی رہیں گے۔ کم عقل، اناڑی، بدھو، بس۔''

وہ صرف اسی مذاق پر چڑتی تھی جب اس کے ذہنی معیار و صلاحیت کو نشانہ بنایا جاتا۔ درحقیقت وہ تھی بھی سادہ و سطحی، خود میں گم، مگن، بے پروا۔

.....

''ابا جی! اتنی ساری لڑکیاں ہیں۔ میں کوئی اکیلی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی۔ خدا جانے کہاں ماری ماری پھریں گی۔'' اماں نے قطعیت سے کہا۔ بھائی میاں نے اور چھوٹے بھائی نے اعتراض نہیں کیا۔

''ابا جی! رات نہیں ہوگی۔ ہم سورج چھپنے سے پہلے آ جائیں گے۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔

''جانے دیں ابا جی! سب لڑکیاں جاتی ہیں۔'' چھوٹے بھائی نے سفارش کی۔

''اے ہاں۔ اور ڈبو دو۔'' دادی جان بڑبڑائیں۔

آخر کار اجازت مل گئی۔

اس نے میرون سادہ بڑا فٹ سا سوٹ پہنا۔ لپ اسٹک لگائی، کاجل ڈالا۔ بے حد خوشی سے اس نے اہتمام کیا۔ بی۔ اے فائنل کی تمام اسٹوڈنٹ اس پکنک میں شامل تھیں۔

سارا دن انھوں نے سمندر کے کنارے ہنستے کھیلتے گزارا۔ تب اس نے جانے سے آدھ گھنٹے پیشتر ساحرہ کا ہاتھ تھاما اور ننگے پاؤں دور تک نکل گئی۔ کبھی کبھار وہ لہرا کر آنے والی لہر سے پیشتر پانی میں جا کھڑی ہوتی، لہریں اسے چھو کر واپس پلٹ جاتیں۔ تب وہ مسرت انگیز ہنسی ہنستی۔ ساحرہ کو پانی سے بہت خوف آتا تھا۔ تب جھاگ جھاگ پاگلوں کی طرح ٹکراتی لہر..... اس کے پیروں سے چھو کر گئی تو اس نے ساحرہ کو پکارا۔

''ساحرہ! آؤ ناں..... بڑا مزا.....'' اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ ساحرہ کی آنکھوں سے اُوجھل تھی۔ ساحرہ کے حلق سے کئی خوف زدہ چیخیں اُبل پڑیں۔ وہ پاگلوں کی طرح پانی کی سمت دوڑی۔ پانی سے ازحد خوف زدہ ہونے والی لڑکی۔ سہیلی کی خاطر پاگلوں کے انداز میں پانی میں اترنے لگی۔ تب کسی نے اسے بازو سے پکڑ کر خشکی کی جانب دھکا دیا۔ اور ساحرہ کے کانوں میں کسی وزنی چیز کے پانی میں گرنے کی آواز آئی۔ وہ بری طرح چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ دوسرے لوگ ان سے بہت دور تھے۔ وہ دونوں تو خود اساتذہ کی آنکھ بچا کر نسبتاً خاموش گوشے میں آئی تھیں۔

تب ساحرہ نے آنسوؤں کی دُھند میں دیکھا۔ انتہائی خوبصورت جسم کا ایک شخص آشیانہ کو بازوؤں میں اٹھائے باہر آیا۔ وہ سرتاپا شرابور تھا۔ وہ دیوانہ وار آشیانہ کی جانب لپکی جس کے چہرے پر موت کا سا سکوت تھا۔

''شانو... !شانو... !اوہ میرے خدا!.....'' دوسرے لمحے وہ خود بھی بے ہوش تھی۔

تب اس شخص نے انتہائی بے چارگی سے دو بیہوش خواتین کو دیکھا۔ پھر ادھر دیکھنے لگا۔ سامنے سے طالبات اساتذہ کے ہمراہ ان کی تلاش میں آ رہی تھیں۔ انھیں اس طرح ریت پر پڑا دیکھ کر تمام اساتذہ اور لڑکیوں کے چہرے فق ہو گئے۔

تب اس اجنبی نے تمام تفصیل سے مطلع کیا۔ میڈم اس کی گاڑی میں آشیانہ اور ساحرہ کو لے کر قریبی کلینک میں چلی گئیں۔ باقی گروپ بھی بجھا بجھا سا واپس ہو لیا۔

.....۞.....

''اس لیے ہی منع کر رہی تھی۔ موت کے منہ سے واپس آئی ہے۔ جو بچے ہٹ دھرمی دکھاتے ہیں، یہی ہوتا ہے ان کے ساتھ۔'' اماں اس کی حالت دیکھ کر تڑپ رہی تھیں مگر بظاہر پند و نصائح کے دفتر کھولے بیٹھی تھیں۔

''خدا جانے کون فرشتہ خصلت آدمی تھا۔ خدا سلامت رکھے اسے بھی۔'' دادی جان نے دعا دی۔

''تیرنا آتا ہوگا کود گیا۔ اس میں فرشتہ خصلت ہونے کی کیا بات ہے؟'' اس نے کراہ کر احسان فراموش کی قبر پر لات ماری۔

''تجھے تو اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اس حالت میں بھی دماغ میں اسی طرح

کلف لگا ہوا ہے۔ نہ کودتا وہ تجھے بچانے کو۔'' اماں کچھ زیادہ ہی احسان مند ہو رہی تھیں۔

''مر جاتی تو آپ لوگوں کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔'' اس نے کراہ کر کروٹ بدلی۔

اماں اس کی ہائے پر تڑپ کر رہ گئیں۔ اس لیے کچھ بولیں نہیں۔

''دیکھو..... بالکل جھٹک کر رہ گئی ہو۔ آج سے دودھ کے دو گلاس پینا۔'' بھائی میاں نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

.....۞.....

ساحرہ اور وہ تو عرصہ تک سوچ سوچ کر کانپتی رہیں۔

''بڑا بہادر آدمی تھا۔''

''آدمی بھی بہادر نہ ہو تو گدھے بہادر ہوں گے۔ اس کو تیرنا آتا ہوگا لہٰذا جان بچانا اس کا فرض تھا۔''

''تو تو دو دن بعد ہوش میں آئی تھی۔ میں نے تو اس کا بہت بہت شکریہ ادا کیا تھا۔''

''ماشاء اللہ تیرا تو اُٹھان بھی غضب کا ہے۔ کسی دُبلے پتلے آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ تو پہلوانوں کو بھی مات دے گیا ہے۔ بے ہوش آدمی کا وزن تو ویسے بھی بڑھ جاتا ہے۔'' ساحرہ نے مزید مدح سرائی کی۔

''مگر کچھ مغرور سا تھا۔ ہم نے اس کا اتنا شکریہ ادا کیا اور اس نے جاتے ہوئے صرف ایک بات کی وہ بھی ڈاکٹر سے۔''

''ہوش جلد آ جائے گا نا؟'' یوں ہی کہہ دیتا یہ میرا فرض تھا۔ کوئی بات نہیں بابا۔ کچھ نہیں بولا۔'' ساحرہ نے ازحد حیرانی سے بتایا۔

''ویسے بھئی، غرور آ ہی جاتا ہے۔ شکل بھی خوبصورت، باکسروں کی طرح جسم، اتنی عالی شان گاڑی، کوئی لینڈ لارڈ ہی لگتا تھا۔''

''اچھا بابا، بس کرو۔ بہت ہو گئیں تعریفیں۔'' اس نے منہ بنا کر ٹوکا۔

.....۞.....

''اماں! گرمیاں آ گئی ہیں۔ میں ایک دو جوڑے لاؤں گی لان کے۔''

''کس کے ساتھ جاؤ گی؟''

''ساحرہ اور میں۔''

تب اماں نے کچھ رقم اسے دے دی۔ جب سے یہ حادثہ ہوا تھا۔ اماں تو بہت ہی سہم گئی تھیں۔ انھیں یہ احساس ہوتا کہ وہ اسے ہر وقت بددعا دیتی رہتی ہیں۔ اب اللہ ایک ہی کو سب کچھ نہیں دے دیتا۔ سب لڑکیوں میں حسن اور قابل رشک صحت دے کر اسے ممتاز بنا دیا تھا۔ کچھ اس نے اپنی جمع پونجی نکالی اور دونوں بازار چلی گئیں۔ کپڑا، لپ اسٹک کے نئے شیڈز، رومال اور خوبصورت آویزے۔ وہ بہت مگن رہی۔ شام بھی کافی در آئی تھی۔

دونوں اسٹاپ پر آ گئیں۔ ساحرہ کی مطلوبہ بس آ گئی۔ وہ چلی گئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھی تو اس کی چپل ٹوٹ گئی۔ ''اوہ میرے خدا! یہاں تو کوئی موچی بھی نظر نہیں آ رہا۔ عام سی سادہ چپل تھی جو وہ گھر میں بھی استعمال کرتی رہی تھی اور پھر شرمندگی بھی بہت ہو رہی تھی۔ وہ بے بسی سے آتے جاتے ٹریفک پر نظر ڈالنے لگی۔ اکیلے رکشا میں جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

تب اس نے سفید نئے ماڈل کی گاڑی کو دیکھا جسے ایک بہت پُروقار خاتون ڈرائیو کر رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔

''سنیں، میری چپل ٹوٹ گئی ہے۔ چلتے ہوئے بڑی شرمندگی ہو رہی ہے۔ آپ کی بہت نوازش ہوگی اگر آپ۔''

''آؤ!'' انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ پیکٹوں سمیت جلدی سے اندر بیٹھ گئی اور گھر کا پتہ بتا دیا۔

''آپ کو گاڑی چلاتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟'' اس نے سادگی سے پوچھا۔

''نہیں بھئی، تم سے بھی چھوٹی تھی تب سے چلا رہی ہوں۔ اب کیسا ڈر؟'' وہ مسکرائیں۔

''اچھا جب گاڑی سیدھی سیدھی جا رہی ہوتی ہے تو اسٹیئرنگ کو دائیں بائیں حرکت کیوں دیتے رہتے ہیں؟''

''اس لیے کہ گاڑی بیلنس میں رہے۔'' انھوں نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈال کر کہا۔

''اچھا!'' اس نے بڑے مگن سے انداز میں کہا۔ سفید کالج کے یونیفارم میں سفید انتہائی شفاف دوپٹے میں اس کا گلابی چہرہ بے حد سادہ تھا جس پر بھولپن کی چھاپ بھی گہری تھی۔ وہ بہت سنجیدہ سی تھی۔ تب اس خاتون نے پوچھا۔

''تم اسی طرح سنجیدہ رہتی ہو یا ہنستی بھی ہو؟''

''بہت ہنستی ہوں میں تو۔ گھر میں بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔'' وہ کھوئی کھوئی سی ہنس پڑی۔

وہ انھیں دروازے تک لے آئی تھی۔

''آپ کا بے حد شکریہ۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کا قیمتی وقت ضائع کیا۔'' وہ انتہائی سلیقے سے کہہ رہی تھی۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو اندر آ جائیں، میں آپ کو اپنے گھر کی دو ''جلالی'' خواتین سے ملواؤں۔'' وہ شگفتگی سے ہنسی تو وہ خاتون..... بے ساختہ گاڑی سے باہر آ گئیں۔

چاول پھٹکتی اماں حیران ہو گئیں۔ جب اس کے ہمراہ ایک انتہائی معزز خاتون کو آتے دیکھا۔

''اماں! یہ میری ان محسن سے بڑی محسن ہیں جنھوں نے مجھے سمندر سے نکالا تھا۔ دیکھیں نا، اگر وہ نہ بچاتے تو میں مر جاتی۔ کہانی ہی ختم ہو جاتی۔ مگر ایک پاؤں میں چپل نہ ہونے سے..... سارے راستے شرمندگی کی موت سے کئی بار مرتی۔ یعنی تمام راستے مرگ و جنم کا سلسلہ چلتا رہتا۔''

''ایک دم باؤلی ہے۔ یہ کوئی کسی سے ملوانے کا طریقہ ہے۔ آئیں آپ یہاں بیٹھیں۔'' اس نے چھوٹے بھائی کی رائیٹنگ ٹیبل کی چیئر انہیں پیش کی۔ اماں کی ڈانٹ ادھوری رہ گئی۔

دادی جان بھی آ گئیں۔ پوری صورتِ حال سے واقف ہو کر اماں بے زاری سے بولیں۔

''آندھی، طوفان کی طرح ہے اس کا چلنا پھرنا، انسان گھر سے دیکھ کر جائے اپنی چیزیں۔''

''یہ تو بہن ہے ہی بے عقل۔'' اماں نے بے چارگی سے بتایا۔

وہ خاتون جو بڑی دلچسپی سے مسکرا رہی تھیں ہنس پڑیں۔ ''ارے نہیں، بڑی پیاری بیٹی ہے آپ کی۔ اور بھی بچیاں ہیں؟''

''ایک اس سے بڑی ہے اور ایک اس سے چھوٹی..... دونوں ہی بیاہی ہوئی ہیں۔ اپنے اپنے گھر خوش ہیں۔ دو لڑکے ہیں۔ دونوں لڑکیوں سے بڑے ہیں۔ ایک کو تو پڑھنے کا ہی بہت شوق ہے۔ ڈبل ایم۔ اے کر رہا ہے۔ کہتا ہے اپنا اخبار نکالوں گا۔ بڑا بھی نیا نیا ملازم ہوا ہے۔'' اماں نے تفصیلی تعارف کرایا۔

''اس کی شادی کیوں نہیں کی پہلے؟ چھوٹی کی شادی۔''

''اصل میں اُسے میرے بھائی نے بچپن میں مانگ لیا تھا۔ ان کی چیز تھی، اب لیتے کہ تب لیتے۔''

ان خاتون کو یہ کھلا ڈھلا بے ریا ماحول بے حد بھایا۔ جب وہ جانے لگیں تو وہ بے انتہا محبت سے ملی۔ اماں نے انھیں دوبارہ آنے کا کہا اور شکریہ ادا کیا۔

''اور بیٹی! ہنستی رہا کرو۔ اچھی لگتی ہو۔'' انھوں نے اسکا رخسار تھپتھپایا۔

''بھلی عورت ہے۔ کتنی امیر زادی ہے مگر ذرا غرور نہیں، ذرا نشہ نہیں دولت کا۔'' دادی جان نے تعریف کی۔ ''اپنے بچوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔''

اماں نے چاول میں دوبارہ ہاتھ مارنے شروع کیے۔ ''تھی کوئی بھلی مانس۔''

.....

وہ تو حسب عادت بھول بھال گئی۔

آخری پیپر دے کر وہ گھر پہنچی تو پتہ چلا کہ وہی گاڑی والی خاتون آئی تھیں۔

''کیوں آئی تھیں؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''کیوں پابندی ہے کیا؟ محبت کی عورت ہے گزری ہوگی اِدھر سے چلی آئی۔'' اماں نے سوال و وضاحت ساتھ ساتھ کی۔

''اچھا! انھیں یاد رہ گیا مجھے تو ذرا یاد نہیں۔'' اس نے لاپرواہی سے دوپٹہ سنبھال کر کہا۔

''کیوں تم کیا خاص پیمانہ ہو کہ ہر شخص کی پیمائش تمھارے حساب سے ہوگی۔''

چھوٹے بھائی نے اسے چھیڑا۔

''تم تو دودھ کی دعا کیا کرو۔ بہت مشہور ہو رہا ہے آج کل کہ لوگ ''پانی میں دودھ'' ملا کر بیچ رہے ہیں۔'' وہ ہنسے۔

''دیکھ رہی ہیں اماں! میرے ایک گلاس دودھ کا اس گھر پر کتنا بوجھ ہے۔''

''اور کیا؟ چل تجھے بھی پتہ چل گیا کہ بیٹی ایک بوجھ ہوتی ہے۔'' دادی جان نے صرف بوجھ سن کر ہی گفتگو کا رخ حسب منشاء کر لیا۔

''اس کا تو کچھ زیادہ ہی بوجھ ہو رہا ہے۔ شکر کرتے ہیں ڈولیوں کے زمانے گئے۔ بے چارے کہار تو زمین بوس ہو جاتے جان بنانے سے زیادہ گھر کی فکر کرو۔''

''اماں بہت ہیں فکر کرنے کو۔'' وہ ہنسی، گویا اماں کو چھیڑا۔

''اے دلہن۔ کچھ کرو بھاگ دوڑ۔ کون پوچھے گا عمر نکل گئی اگر؟'' دادی جان نے دیرینہ خدشہ ظاہر کیا۔

''اے اماں۔ اب تو خدا پر چھوڑ بیٹھی ہوں۔'' اماں نے ساس کو نہایت افسردگی سے جواب دیا۔

''بات تو ساری نصیبوں کی ہے۔ ایک سے ایک کم شکل مہارانیاں ہیں۔ اس موئی میں تو اللہ نے کوئی ظاہری نقص بھی نہیں دیا۔ دونوں سے اچھی ہے۔ خدا اچھا ہی کرے گا۔''

''سلیقہ ہوتا تو کب کی کوئی لے جاتا۔ تم نے بھی سختی نہیں کی۔'' ساس نے بہو کو جتایا۔

''ہاں، بس اماں پھانسی دینے کی کسر چھوڑ دی ہے۔'' انھوں نے ساس کی بات سے اکتا کر جواب دیا اور باہر پودوں میں پانی ڈالتی شانو کو آواز دینے لگیں۔

.....

آج فراغت سے اُکتا کر وہ چھتیں صاف کرنے پر کمر باندھ بیٹھی تھی۔ پُرانا سا جوڑا پہن کر سر پر پرانا مفلر لپیٹ کر بڑے انہماک سے کام میں مشغول تھی۔ پورے گھر میں اسٹول گردش کر رہا تھا۔ لپک ادھر، جھپک ادھر۔ دادی جان نہال ہو رہی تھیں۔ کئی بار سروے کر چکی تھیں اور سروے رپورٹ باورچی خانے میں بیٹھی اس کی بے خبر ماں کو پیش کر چکی تھیں۔

''کیا آج کوئی خاص مہمان آ رہے ہیں؟'' چھوٹے بھائی نے حسب عادت مذاق کیا۔

''کیوں کیا گھر صرف مہمانوں کے لیے صاف کیے جاتے ہیں؟'' اس نے چھت پر ڈنڈے کو گردش دیتے ہوئے الٹا جواب دیا۔

''میں نے ''خاص'' کہا ہے۔''

''ایسی کوئی نیک اطلاع نہیں۔'' وہ شرارت سے ہنس پڑی۔

''اے۔ عثمان..... دیکھ تو سہی بچی نے سارا گھر ہی تو چمکا دیا۔'' دادی جان خوشی سے پوتے سے مخاطب ہوئیں۔

''لگتا ہے دادی جان۔ عقل داڑھ پوری نکل چکی ہے۔'' وہ شرارت سے بولے۔

''چھوٹے بھائی دیکھیں ہر وقت مذاق نہیں۔'' اب اسے تاؤ آ گیا۔

''اے چل چھوڑ۔ ویسے ہی تھک رہی ہے۔'' دادی جان کا مارے لاڈ کے بس نہیں چل رہا تھا۔ اسے گود میں لے کر پھرتیں۔

''آج اسے دودھ کے دو گلاس پلایئے گا۔'' بھائی بھی اسے اس طرح مصروف دیکھ کر خوش تھے مگر بظاہر چھیڑ رہے تھے۔

''چھوٹے بھائی! آپ جائیں یہاں سے۔'' وہ جھلا کر چیخی۔

وہ برآمدے کے ستونوں پر کپڑا مار رہی تھی کہ گھنٹی بجی۔ وہ اپنے ڈنڈے سمیت دروازے کی سمت لپکی۔

''اوہ!'' اس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلائیں۔

''آپ؟ السلام علیکم۔''

''ہاں بیٹی! وعلیکم السلام۔'' انھوں نے شفقت سے جواب دے کر اس کے دلچسپ حلیے پر نظریں دوڑائیں۔ وہ خفت آمیز انداز میں مسکرادی اور انھیں لیے ہوئے اندر چلی آئی۔

''دیکھیں اماں! کون آیا ہے؟'' اماں باہر آئیں اور بڑی گرم جوشی سے ملیں۔

''کیسے تکلیف کی؟ آیئے اندر آجایئے۔'' وہ پُرتپاک انداز میں بولیں۔

''اب تو یہ آپ پر منحصر ہے کتنی تکلیف مزید دیں گی۔'' وہ مسکرائیں۔

اور پھر انھوں نے وہ بات کہی کہ کسی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ رہا۔ دادی جان نے گلاس بھر پانی نوری پیا۔

''میرا سسرالی سلسلہ بے حد مختصر ہے۔ میکہ بھی چھوٹا ہے جو تقریباً پچھلے پندرہ سال سے امریکہ میں مقیم ہے۔ میں چھ ماہ پیشتر اپنے بڑے بیٹے کے پاس آئی تھی۔ سوچتی ہوں اس کا گھر بسا دوں۔ وہ دو سال پہلے پاکستان مستقل آچکا ہے۔ ہیرا تو نہیں کہوں گی۔ عام انسان ہے۔'' ان کی آواز دھیمی ہوگئی۔ میں خود ہی اپنے میکے اور سسرال میں بڑی ہوں۔ جب جواب لینے آؤں گی تو بہن اور بہنوئی کو بھی لاؤں گی۔ آپ اپنے شوہر سے مشورہ کیجئے۔ سوچ سمجھ کر جواب دیں میں جانتی ہوں میرے بیٹے کے لیے کیسی لڑکی موزوں رہے گی۔ اور آج بلا تکلف میں آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوئی۔'' اس انکسار پر دونوں ساس بہو سوجان سے مرمٹیں۔

''آپ یہاں نہیں رہیں گی؟'' اماں نے جانے کیوں سوال کردیا۔

''میرے دو بچے وہاں زیرِ تعلیم ہیں۔ ایک بیٹا وہاں پر کاروبار کرتا ہے۔ بچوں کی وجہ سے فی الحال وہیں ہوں۔ شوہر کا دو برس پہلے انتقال ہوگیا۔'' انھوں نے افسردگی سے بتایا۔

اپنے خاندان سے متعلق انھوں نے مستند معلومات بہم پہنچائیں۔ جاتے ہوئے مزید کہا کہ آپ اپنا خوب اطمینان کرلیجئے۔

اور اس رات وہ پہلی مرتبہ گم صم سی رہی۔ خدا جانے کون ہے؟ کیسا ہے؟ بالکل اجنبی

لوگ۔ اس کا دل لرز رہا تھا۔ سب تو خوش ہوں گے۔ ''ہاں'' میں جواب دیں گے سب سے بڑا بوجھ جو ہوں میں۔

تمام کوائف اکٹھے کر کے غور وخوض کیا گیا۔ ابا اسے معہ بیٹوں اور بھائیوں کے دیکھ آئے تھے۔ چھوٹے بھائی نے اسے بتایا۔ ''تیس اکتیس برس کا لگتا ہے۔ بے حد سنجیدہ اور کم گو مگر بہت شاندار شخصیت کا مالک۔ مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا یہ پیغام اس کے لیے آیا ہے۔'' انھوں نے کنکھیوں سے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کا اپنا کاروں کا کاروبار تھا۔ وہ لوگ اس کے شوروم میں مل کر آئے تھے۔

ابا جی نے دبے دبے الفاظ میں اماں کو سمجھایا۔ ''سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ بالکل جوڑ نہیں ان کا ہمارا۔''

''لوگوں کی بیٹیاں تو بادشاہوں کے ہاں بیاہ دی جاتی ہیں۔ یہ تو قسمت کے کھیل ہیں۔ اللہ جسے چاہے نواز دے۔ ترازو سے تل کر آسمان سے نوٹ تو نہیں آتے اس کے پاس۔ محنت کرتا ہے کماتا ہے۔'' یہ اماں کی دلیل تھی۔ پیسہ زیادہ نہیں تھا تو کیا ہوا پشتیں تو معزز تھیں۔ بڑی خود اعتماد تھیں وہ۔ اسے کہتے ہیں نیت صاف منزل آسان۔ اگلے دن رخسانہ آئیں تو کہنے لگیں۔

''اب تو چاہے روز گاڑی بدل لینا۔'' وہ مسکرائیں۔

''ارے نہیں، ایسا نہ کر دینا۔ دیکھنے والے کار ڈیلر کے بجائے موٹر مکینک کی بیوی سمجھنے لگیں گے۔'' بھائی میاں نے برجستہ کہا۔ تو سب بے تحاشا ہنسنے لگے۔ پل کی پل میں خوشیاں اتر آئی تھیں۔

.....۞.....

کچھ زیادہ ہنگامہ نہیں ہوا جب وہ نکاح سے پہلے خاموش بیٹھی تھی۔ بارات آچکی تھی۔ تب اس کی ساس ایک خوبصورت سی لڑکی اور نکھرے نکھرے نوجوان کے ساتھ اس کے پاس چلی آئیں۔

''یہ ہیں بیٹا! تمہاری بھابی..... آشیانہ۔''

زرد سوٹ میں نہائی دھوئی کورے کاغذ کی طرح اُجلی اور صاف بھابی جو اپنی سادگی سمیت دونوں کو بے حد کیوٹ لگی تھی۔

''بھیا نے دیکھا ہے ماما؟'' لڑکی نے پوچھا۔

"ہوں۔ تصویر دکھائی تھی۔" انھوں نے جواب دیا۔

"یہ تمہاری نند ہے بیٹا! فرحت افزا اور یہ دیور...... میرا نمبر تین بیٹا عظیم۔ تمہارا دوسرا دیور جو ان دونوں سے بڑا ہے اعظم، وہ نہیں آ سکا۔ اس نے تمھارے لیے بڑے پیارے پیارے تحفے بھجوائے ہیں۔" وہ سر جھکائے ان کی باتیں سنتی رہی۔

بچے قطعی یورپین طرز کے نہیں تھے۔ مشرقی تہذیب کی چھاپ ان پر نمایاں تھی۔ جو شاید ان کی ماں کا کمال تھا۔ اس کی سہیلیاں آ گئی تھیں۔ ساحرہ اس کی عزیز سہیلی کا بھی آج کے دن نکاح تھا۔ اس کا شوہر باہر جا رہا تھا۔ ایمرجنسی تقریب تھی آج اس کے ہاں بھی۔ اسے بہت افسوس ہوا تھا اس کے نہ آنے کا۔

جب دلہن بنی آشیانہ کو فرحت افزا نے دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گئی۔ سرخ لباس سرخ نگینے جڑا سیٹ۔ صرف سرخ گلاب کے ہار اور گہنے۔ رُوپ بھی کسی کسی کو پوچھتا ہے اور فرحت افزا نے کھڑے کھڑے اس کے پوز کیمرے میں محفوظ کر لیے۔

وہ آج بے تحاشا روئی تھی۔ ایسے رونے کا کبھی تصور نہیں تھا۔ خود بخود دل بھر آ رہا تھا اور آنکھیں برس رہی تھیں۔ تڑپ تڑپ کر، پھوٹ پھوٹ کر رونے کو دل چاہ رہا تھا۔

اور پھر اُسے سہارا دے کر سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس سرخ گلابوں میں چھپے ڈیسنٹ سے انسان کے پہلو میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے اپنے وجود سے اٹھتی خوشبوؤں پر اس شخص کی مہک حاوی ہو گئی۔ دائیں طرف معظم (اس کا شوہر) اور بائیں جانب اس کی ساس اور فرحت تھیں۔ ایک پہلو محسوس کر کے اس نے سمٹنا چاہا مگر یہ ممکن نہ تھا۔ اس پہلو، اس شانے کی اس کے ماں باپ اور اسکے دل نے بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی۔

سسرال میں عجب تماشا تھا۔ گھنٹوں اس کا گھیراؤ رہا۔ کوئی مووی بنا رہا تھا۔ کوئی جامد تصویر۔ کیمرے۔ فلش۔ ایک چکا چوند تھی۔ اس کے ہمراہ رخسانہ باجی تھیں۔ وہ بھی بوکھلا کر رہ گئیں۔ جب رات دو بجے اس کے رشتے کی جٹھانی اسے کمرے میں لائیں تو بڑا الٹا حساب تھا۔

معظم بیڈ پر نیم دراز کسی کتاب میں مصروف تھے۔

"ارے بھئی، آپ پہلے سے موجود ہیں یہاں؟" بھابی ہنسیں۔

"بہت شور تھا باہر، کچھ تھک بھی گیا ہوں۔"

من جھنجوڑتی بھاری سی آواز تھی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

معظم نے اسے دیکھا۔ تصویر سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ بھابی کی موجودگی کا احساس تھا۔ اس لیے فوری نظروں کا رخ بدل دیا۔

وہ اسے بیڈ پر ٹکا کر واپس پلٹ گئیں۔

اس کی عجیب کیفیت تھی۔ حرکت کرتے ہوئے ایک شرگیں سا احساس دامن گیر تھا۔

"ایزی ڈارلنگ۔" وہ پردے برابر کرتے ہوئے بولے۔

وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

تب گھونگھٹ الٹ دیا گیا اور معظم ٹھٹک گئے۔ ایک بھیگا وجود...... ان کے بازوؤں میں جھولنے لگا۔ وہی...... بالکل وہی۔ وہ پہچان چکے تھے۔ اس قدر مناسب لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں جو حسین بھی ہوں اور ان کا سراپا بھی ان کی خوبصورتی کا ہمسر ہو۔

انھوں نے اسے ٹھیک سے بیٹھنے کو کہا۔ مگر وہ اسی طرح ساکت رہی۔ انھوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ تو اس نے اپنے وجود کا ہر حصہ چرا لیا۔

انھوں نے اس سے زیادہ باتیں نہیں کیں۔ پھر بھی جو کچھ کہا اسے اچھا لگا۔

اور پھر جب وہ دنیا کا مکروہ ترین مشروب پی کر آئے تو اس کا دم الٹنے لگا۔

اور انہی گھٹتی ہوئی سانسوں کے دوران اس پر حیرت ناک انکشاف ہوا کہ یہ وہی محسن ہے جو سمندر کی لہروں سے لڑ کر اسے جیت لایا تھا۔

پھر انھوں نے بہت کچھ کہا۔ مگر وہ دم سادھے رہی ایک ٹک ساکت۔

اور جب وہ بے خبر سو گئے تو آہستگی سے اٹھی۔ اپنا دوپٹہ تہہ کیا۔ اس کا ذہن گہری سوچوں میں گم تھا پھر اس نے سنگھار میز کے مقابل کھڑے ہو کر اپنا ایک ایک زیور اتارا۔ اس کے ناک اور کان سخت دکھ رہے تھے۔ گلے پر نیکلس، مالا اور ہار کے نشان پڑ گئے تھے۔ اس نے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹا۔ اپنا چہرہ آئینے میں دیکھا۔ عجب دیومالائی حسن تھا۔ اس نے آنکھوں میں جھانکا تھکی سی آنکھیں، خوابیدہ آنکھیں۔ آرزو شکستہ آنکھیں۔ تب وہ ہتھیلی میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کیوں؟ وہ خود بھی نہ جان سکی۔

* * *

جب صبح اس کی آنکھ کھلی تو رات کی تھکی ماندی خواتین ہشاش بشاش تھیں۔ کوئی پردے سرکا رہی تھی کوئی اس کا زیور ڈبوں میں لگا رہی تھی۔

''ارے بھئی۔ دلہن بیگم اتنی لاپرواہی اچھی نہیں ہوتی۔ بے حد قیمتی زیورات ہیں۔ یہ دیکھو اس لاکر میں رکھ رہی ہوں۔ اٹھا کر اپنی مرضی سے کہیں رکھ دینا۔''

''اگر اور نیند آ رہی ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔'' انھوں نے اسے بے خبر انداز میں بیٹھا دیکھ کر کہا۔

خوبصورت جوڑا کھل جانے پر اس کے ریشمی بال پاگلوں کی طرح ادھر ادھر دوڑ پڑے تھے۔ مٹے مٹے میک اپ کے نشان

ارے بھئی۔ تم نے لباس بھی تبدیل نہیں کیا تھا۔ باتھ روم میں تمہارا لباس موجود تھا۔'' بھابی نے کہا۔

''اب پہن لوں گی۔'' اس نے لب کشائی کی۔

ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

''بھئی وہ شب خوابی کا لباس ہے۔ ولیمے کا شاہانہ جوڑا نہیں۔ واقعی بہت نیند آ رہی ہے۔ مگر یہ روزانہ کی مجبوری ہے۔ اب نیندیں تمہاری نہیں رانی! ساجن کی ہیں۔ چلو اٹھو۔ غسل سے فارغ ہو جاؤ۔ تیار ہو جاؤ اچھی طرح۔ ناشتے پر تمہارا انتظار ہے۔''

بے حد خوبصورت پیازی کلر شلوار سوٹ منتخب کر کے وہ اسے دے گئیں۔

ان کے جانے کے بعد کمرے میں سکوت سا چھا گیا۔

وہ نہا دھو کر بالوں کو برش کر رہی تھی، ہلکے سے میک اپ کا بھی نشان نہیں تھا۔ تب ہی اس کی ساس آ گئیں۔ اس نے آداب کرنے سے پہلے انھیں بغور دیکھا۔ وہ سٹپٹا سی گئیں۔ تب اس نے بغیر کسی جذبے کے انھیں آداب کہا۔

''خوش رہو۔ چلو دلہن! تمہارا انتظار ہو رہا ہے ناشتہ پر۔'' اسی وقت فرحت افزا بھی داخل ہوئی۔

''ماما! لے بھی آئیں بھابی جان کو۔ اوہ، پیاری بھابی لوگ میک اپ کر کے حسین لگتے ہیں۔ اور آپ بغیر میک اَپ کے۔'' اس نے پُرستائش نظروں سے اسے دیکھا۔

ڈرائینگ روم کی وسیع و عریض ٹیبل پر کافی لوگ تھے۔ سب ہی ان لوگوں کے قریبی رشتہ دار تھے۔ معظم نے اسے دیکھا اور مسکرائے۔

اس نے اپنی مسکراہٹ ہونٹوں میں جذب کر لی۔

ولیمہ شام کا تھا۔ دوپہر گیارہ بجے وہ گھر چلی آئی۔ فرحت اس کے ہمراہ تھی۔ باقی لوگ واپس چلے گئے تھے۔ اسے چھوڑ کر تب ہی ساحرہ آ گئی۔ کیوٹ سی فرحت افزا اسے بے حد پسند آئی۔ فرحت افزاء کی موجودگی کے سبب وہ سکھی ہے۔ بے تکلفانہ گفتگو تو نہ کر سکی، پھر بھی کوڈورڈز میں باتیں کر ہی گئی۔ اس نے جان بوجھ کر رات کا انکشاف نہیں دُہرایا کہ دیکھتے ہیں ساحرہ، معظم کو پہچانتی ہے یا نہیں۔

رخسانہ باجی اور نغمانہ بھی وہیں آ گئیں۔

''آپا شانو! کوئی زیور تو پہن لینا تھا۔'' نغمی نے ٹوکا۔

''زیور ہی زیور ہیں بھابی کے پاس۔ ویسے یہ بغیر زیور کے زیادہ پیاری لگتی ہیں۔'' فرحت نے پیار سے کہا۔

''پتہ ہے بھابی! ساجد بھائی کی دلہن رات کیا کہہ رہی تھیں؟'' سب نے سوالیہ انداز میں فرحت کو دیکھا۔

''کیا کہہ رہی تھیں بھیا سے کہ دلہن کا نام آشیانہ ہے۔ تم اپنا نام ''آباد'' رکھ لو۔ مسز آشیانہ آباد خوب سوٹ کرے گا۔'' فرحت کی بات سن کر سب بے ساختہ ہنس دیے۔

رخسانہ نغمانہ کو اس کی قسمت پر رشک آ رہا تھا۔ کتنا دولت مند گھرانہ تھا مگر غرور کسی میں نہ تھا اور پھر جب ساحرہ نے معظم کو دیکھا۔ تو بے ساختہ اُچھل پڑی۔

''اے شانو! جو سامنے براؤن سوٹ میں ہے وہی معظم ہیں نا..... یہ تو وہی ہیں جنھوں نے تمھیں پانی سے نکالا تھا۔'' دلہن بنی آشیانہ نے دھیرے سے نظریں اٹھا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بھئی، اس وقت تو بڑے مغرور سے لگے تھے۔ فوراً ہی کلینک سے چلے گئے تھے۔ ویسے کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔

''ہونہہ! صرف ٹھیک ہیں۔ ارے شاندار۔ تجھے پتہ ہے یہ وہی حضرت ہیں جو.....''

''مجھے پتہ ہے۔ انھوں نے بتا دیا تھا کل۔'' اس نے بات کاٹی۔

''تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟'' وہ خفگی سے بولی۔

''کیا بہت ضروری تھا؟'' وہ مسکرائی۔

''یہ بتاؤ۔ کیسی عادت ہے؟ پسند تو آئے نا تمھیں؟''

''ابھی سے عادتوں کا کیا پتہ؟'' اس کی آواز دھیمی اور سنجیدہ ہوگئی۔

''ویسے کنٹرول رکھنا۔ بڑے آفت ہیں۔''

''میں جانتی ہوں کس قدر کنٹرول کے لائق ہیں۔'' اس نے افسردگی سے سوچا۔

.....

اور..... آج پھر جب وہ شغل کر رہے تھے۔ تو وہ ان کے پاس چلی آئی..... کراہت ہونے کے باوجود۔

''سنیں۔ کیا بہت ضروری چیز ہے یہ؟''

''دیکھو! آج سے ایک عہد کرو۔ تم میرے کسی معاملے میں نہیں بولو گی۔ ماما مجھے کہہ رہی تھیں تمھارے سامنے اس قسم کے مظاہرے نہ کروں۔ مگر بھئی، بیوی سے ڈرنے اور چھپانے کا میں قائل نہیں۔'' انھوں نے گلاس ہلا کر برف گھلانے کا عمل کیا۔

''اس سے بہت بری بو آتی ہے۔'' اس نے ناک سکوڑ کر کہا۔ ''صحت الگ خراب ہوتی ہے۔''

''اب میں تمہاری خاطر اس میں پرفیوم چھڑکنے سے تو رہا۔'' عجیب روکھائی سے جواب ملا۔

''مجھے اپنی لک پر ناز ہے۔ تمھیں ایک بات بتاؤں۔ میں شطرنج میں کبھی نہیں ہارا۔ ریس سے جب بھی واپس ہوتا ہوں، میرے بینک بیلنس میں لاکھوں روپے کا اضافہ ہوتا ہے۔ شرط کبھی نہیں ہاری۔ کسی بھی حسین عورت کے لیے مجھے کبھی کوئی جتن نہیں کرنا پڑے۔''

نشہ آہستہ آہستہ تیز ہو رہا تھا۔ اسے گھبراہٹ محسوس لگی۔

''ماما کے خیال میں، میں غلط چل رہا ہوں۔ وہ میرے لیے مڈل کلاس ایسٹرن گرل چاہتی تھیں۔ میں نہیں مانتا تھا، میں جانتا ہوں ان لڑکیوں کو۔ شیشہ سمجھتی ہیں خود کو، ان کی مٹی میں صرف گناہ ثواب ہوتے ہیں۔ مذہب اچھی چیز ہے۔ اور میں تمھیں کسی چیز کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔''

اور وہ ایک سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔

معظم نے اپنا پورا بوجھ اس پر ڈال دیا۔ ''تم میری قسمت میں تھیں شاید تبھی جیل

جانے کا بہانہ ہوا۔ دو سال شکاگو جیل میں رہا ہوں۔ ماما نے زبردستی مجھے پاکستان بھیجا۔ بہت خوف زدہ ہیں مجھ سے۔ تم نہ ڈرنا۔ جو ڈرتا ہے وہ مرتا ہے۔ پتہ ہے نا تمھیں؟''

وہ بمشکل انھیں بیڈ تک لائی۔ تکیے پر سر رکھ کر وہ بری طرح رو دی۔ ''ماں! کونسی گھڑی ہنسنے پر بددعا دی تھی؟ وہ کونسی گھڑی تھی جب تو نے ہنسنے پر کوسا تھا؟''

.....

فرحت اور ماما تو فوراً ہی امریکہ چلی گئیں۔ وہ اتنے بڑے ڈھنڈار سے گھر میں بولائی سی پھرا کرتی۔ اماں کی طرف کم ہی جاتی تھی۔ جس دن جانا ہوتا صبح ہی معظم سے کہہ دیتی۔

''آج اماں کی طرف جاؤں گی۔ شام کو لیتے آیئے گا۔''

یہ سوچ کر وہ اور بھی کم میکے جاتی تھی کہ معظم کو اس کا جلد جانا ناگوار نہ گزرے۔ وہ لحاظ کی سرحد درمیان میں رکھ کر اپنے خوف کو کچھ کم کرنا چاہتی تھی۔

کبھی کبھار رخسانہ باجی کے ہاں اور نغمانہ کے ہاں چلی جاتی۔ جب بھی وہاں جاتی ڈھیروں پھل مٹھائیاں لے جاتی۔ وہ دونوں اسے بہت ٹوکتی تھیں کہ اتنا خرچ مت کیا کرو۔ میاں کے علم میں لا کر ہر کام کیا کرو۔

دولت نے آشیانہ میں کوئی چھچھورپن پیدا نہیں کیا تھا۔ اپنی پسند کے سادہ سادہ کپڑے پہنتی یا پھر ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں۔ نہ آئے دن شاپنگ سینٹر جاتی نہ سب میں بیٹھ کر اپنی امارت کے قصے چھیڑتی۔ اماں کے ہاں جاتی تو فوراً گھر کے کاموں میں لگ جاتی کہ انھیں میری امارت کا احساس نہ ہو۔ کوئی احساس کمتری نہ ہو۔ اس کے اپنے گھر میں ڈش واشر سے برتن دھلتے تھے۔ اماں کے ہاں آ کر راکھ سے پتیلیاں رگڑتی، ابا جی کے پرانے کپڑے رفو کرتی۔ اس کا کتنا جی چاہتا ابا جی کے لیے قیمتی شیروانیاں سلوائے، قیمتی لان کے کرتے بنوائے۔ انھیں قیمتی آرام دہ چپل لا کر دے۔ اپنی درجنوں سونے کی چوڑیوں میں سے چار ماں کے ہاتھ میں ڈال دے مگر وہ جانتی تھی اس کے گھر کا کوئی فرد اس سے چند سکے بھی لینا گوارا نہیں کرے گا اور وہ ان کی خودداری کو تازیانہ نہیں مارنا چاہتی تھی۔ البتہ اتنا ضرور کہہ دیا:

''اماں! اب تو بھائی میاں اچھی پوسٹ پر ہیں۔ گھر کے کاموں کے لیے ملازمہ رکھ لیں۔ تھک جاتی ہوں گی۔''

''ساری عمر کام کیا ہے۔ کیسا تھکنا؟ بہوئیں آ جائیں تو وہ کریں گی اب تو، چاہے خود

کریں یا نوکرانیاں رکھیں۔'' اماں نے اسے محبت سے دیکھ کر جواب دیا۔

''دیکھا اماں! میں نہ کہتی تھی شادی کے بعد سب عقلیں آ جاتی ہیں۔ دیکھو کتنا احساس کرتی ہے۔''

''مگر چپ چپ رہتی ہے۔ وہ شانو تو لگتی ہی نہیں۔'' اماں نے ساس سے کہا۔

''اے ہاں دُلہن! اب ذمہ دار ہوگئی ہے نا..... خدا نصیب اچھا رکھے۔'' انھوں نے بھی محبت بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا بات ہے شانو! بہت جھنک کر رہ گئی ہو دودھ نہیں ملتا؟'' چھوٹے بھائی نے مذاق کیا۔

''دودھ تو بہت ہے ہر جگہ۔ بس دل ہی نہیں چاہتا۔'' اس نے بجائے چڑنے کے بڑے گم صم انداز میں جواب دیا۔

.....

''سنیں..... آپ کیوں پیتے ہیں؟'' آج اس نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

''ہونہہ..... کل کو کہو گی ریس کیوں کھیلتے ہیں؟ اتنی حسین گرل فرینڈز کیوں بناتے ہیں؟ اپنی اوقات میں رہو۔ آشیانہ بیگم! میں نے شادی اس لیے نہیں کی کہ میں تم پر عاشق ہوگیا تھا۔ اس لیے نہیں کی کہ مشرق پرست ہوں۔ صرف اور صرف اس لیے کہ میری عمر بھی ایسی تھی۔ میں اس اسٹینڈرڈ سوسائٹی میں بغیر مسز کا تھا۔ اس پر میری ماں کا اصرار۔ اچھا ہے گھر میں بیوی بھی ہو کیونکہ گرل فرینڈ اور بیوی میں بہرحال فرق ہوتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہوتیں کہ انہیں مستقل گھر میں جگہ دی جائے اور تم مجھے ٹوکنے کی خطرناک غلطی نہ کرنا۔ یہ کام تو میری ماں نہ کر سکی۔ شاید تم جانتی ہو میرے والد نے مجھے عاق کر دیا تھا۔''

یہ نیا دھماکہ تھا۔

''اور انھوں نے میری شکل نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی۔ مگر ان کے انتقال کے بعد ماما نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ مگر ایک اہم قانون شکنی کے بھگتان پر میں دو سال شکاگو جیل رہا۔ وہاں سے رہا ہوا تو ماما نے مجھے پاکستان بھجوا دیا۔ اور میں نے اپنا بزنس کر لیا یہاں۔ مجھے کہتی تھیں تمھیں کوئی حد درجہ مشرقی لڑکی لا کر دوں گی، بیوی کی شکل میں تاکہ وہ تمھیں سنوار دے۔''

وہ بڑی سچائی سے اسے تمام باتیں بتا چکا تھا۔ وہ جو ماما سے سخت بدظن ہوگئی تھی۔ ان

پر ترس آنے لگا۔

''تو ماما یہ بھایا تھا تمھیں قربانی کا جانور۔'' اس نے زہر خند انداز میں سر کو جھٹکا۔

''ہاں تو بھئی۔ کیا کیا سنوارو گی میرا؟''

اس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ گولڈن نائٹ گاؤن اور چمکتے سیاہ بال دونوں بازوؤں کا تکیہ بنائے۔ وہ اسے بڑی طنزیہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر دیکھ رہے تھے۔

''کاش، تمھارے اعمال بھی تمھارے ظاہر کی طرح حسین ہوتے تو میں خود کو خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔ لعنت ہے اس عورت کی زندگی پر جسے اپنے شوہر کی وفائیں حاصل نہ ہوں۔ جو باہر چلا جائے تو دل وسوسوں میں گھر کر رہ جائے۔ جو رات کی تاریکی میں کھڑکی دروازوں سے لگ کر اندازوں سے کھیلے۔ اب آتا ہوگا تب آتا ہوگا۔''

وہ الماری کی جانب بڑھے تو جھٹکے دینے سے دروازہ نہ کھلا۔

''کیا یہ لاکڈ ہے؟'' وہ گھومے۔

''مجھے کیا پتہ؟ میرا تو اس الماری سے کوئی واسطہ نہیں۔'' اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

''مگر میں نے کبھی اسے لاک نہیں کیا۔'' اس باران کی آواز میں ترشی تھی۔

''تو پھر مجھے کیا پتہ؟ چابیاں اوپر ہیں، دیکھ لیں۔'' اندر ہی اندر اس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ انھوں نے چابیاں لگائیں کوئی بھی فٹ نہیں تھی۔

''میں کہتا ہوں اسے بند کس نے کیا؟'' پل بھر میں وہ وحشی ہوگئے۔ بلوریں گلدان اٹھا کر سنگھار میز کے آئینے پر دے مارا۔ وہ لیٹی ہوئی اندر ہی اندر کانپ رہی تھی لیکن بظاہر بے نیاز تھی۔

انھوں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ آسمانی نائٹ ڈریس میں وہ خوف زدہ انداز میں ہونٹ چبا رہی تھی۔

''بتاتی ہو یا نہیں؟''

''میں کہہ رہی ہوں مجھے کوئی پتہ نہیں۔ صفائی فاطمہ نے کی تھی۔''

''بکواس بند کرو.....

ہزار بار کہہ چکی ہو کہ میرے وجود سے اس کی بو آتی ہے۔ تو دفعان ہو جاؤ کسی اور

کمرے میں۔

بتا دو چابی کہاں ہے۔ ورنہ مجھے سلطان کے پاس اسی وقت جانا پڑے گا۔ اسی سے منگوالوں گا۔ جو تم کر رہی ہو اس میں ناکام رہو گی۔'' وہ جنونی لگ رہے تھے۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں۔''

انھوں نے اس کے گاؤن کی فرل کو زور سے جھٹکا دیا۔ مگر وہ بھی کوئی سیخ سلائی نہیں تھی۔ ان کا ہاتھ اپنے گلے سے جھٹکے سے ہٹا کر بولی۔

''آپ اس قدر زیادتی نہیں کر سکتے۔ جس چیز کا مجھے کوئی علم نہیں۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ کیا بتا سکتی ہوں؟ ہٹیں میرے سامنے سے میں جا رہی ہوں اس کمرے سے۔ کیا میں اس گھر میں سو بھی نہیں سکتی آرام سے؟'' وہ کونسی کم تھی۔

''زیادہ ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نکالو چابی۔ کہاں ہے؟'' انھوں نے اس کا رخسار نرخ کر دیا۔

''جنگلی.....'' وہ تڑپ کر رہ گئی۔

''شرم نہیں آتی تمھیں اتنے بے ہودہ طریقے سے جواب دیتے ہوئے۔'' وہ مزید بھڑک گئے اور ان کے تشدد سے ناک سے خون بہہ نکلا۔ وہ وہیں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وہ تو عادی پینے والے تھے۔ ذرا سی رکاوٹ بھی برداشت نہیں ہوتی تھی۔

تب اس نے بیڈ کے نیچے سے چابی نکال کر ان کی سمت پھینکی۔ خود ناک پر ہاتھ رکھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔

''بے وقوف۔ بدتمیز۔'' وہ چابی پا کر اسے اردو، انگریزی میں گالیاں دینے لگے۔

فرسٹ ایڈ بکس سے اس نے دوا لگائی اور گاؤن بدل کر ماما کے بیڈ روم میں چلی آئی۔

.....

صبح وہ سو کر اٹھی تو جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ بہر حال، اٹھنا تو تھا، گھر بھی دیکھنا تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو پتہ چلا صاحب جا چکے ہیں۔ اس نے ٹائم دیکھا نو بج رہے تھے۔

اس بات کی توقع فضول تھی کہ وہ معذرت کریں گے۔ خدا جانے اسے نباہنے کے ہنر کہاں سے آ گئے تھے۔ لڑ کر میکے جانے کا تو خیال بھی دل میں نہ لاتی۔

اس نے برائے نام ناشتہ کیا۔ گھر کی صفائی کروائی۔ دوپہر کے کھانے سے متعلق

مسئلہ حل کیا۔ کیونکہ دو چار آدمی دوپہر کو ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔

اپنے کمرے میں آئی تو رات کا نقشہ نظروں میں گھوم گیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کہاں سے لاؤں وہ آغوش جس میں سر دے کر اپنا دکھ کہوں۔

دوپہر کو حسب توقع وہ کھانے پر آ گئے تھے۔ کسی انداز سے شرمندگی نہیں جھلکتی تھی۔ وہ ملازم کے ساتھ مل کر کھانا لگوانے لگی۔

''یہ ڈریسنگ ٹیبل وہیں کا وہیں ہے؟'' وہ اس کے سر پر کھڑے پوچھ رہے تھے۔

''پھر میں کیا کروں؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''نوکر سے کہہ کر اس کا آئینہ نہیں بدلوا سکتی تھیں؟''

''اچھا، بدلوا دوں گی۔'' سادگی سے جواب ملا۔

''کبھی خود سے بھی کچھ کر لیا کرو۔ ضروری ہے کہ ہر بات کے لیے کہا جائے۔''

وہ خاموش رہی، نیپکن میز پر رکھ کر وہ ان کی طرف دیکھے بغیر باہر آ گئی۔

خدا جانے یہ صبر و تقویٰ تھا کہ کیا تھا۔ اس نے کبھی بیرونی دنیا پر کچھ ظاہر نہیں کیا۔

ماں پوچھتیں۔ ''خوش تو ہو بیٹی؟''

''خوش نہ ہونے کی وجہ؟ اپنا گھر ہے، اپنی چھت ہے۔'' عجب بے نیازی سے جواب ملتا۔

بہنیں پوچھتیں۔ ''ایڈجسٹ ہو گئی ہو۔ کیسے رہتے ہیں تمھارے ساتھ؟''

''جیسے شوہر رہتے ہیں۔'' بڑے سپاٹ سے انداز میں جواب ملتا۔

''آتے کیوں نہیں؟''

''فرصت نہیں۔''

''پہلے کی طرح کیوں نہیں رہتیں خوش باش، کیا کمی ہے؟''

''خوش ہوں اور کس طرح رہوں؟ آپ لوگ کیا خوشی کے اظہار کے لیے ڈھول پیٹتے ہیں؟'' سرد مہری سے جواب ملتا۔ پرسان حال خاموش ہو جاتے۔ کیسا نہ سمجھ میں آنے والا رویہ تھا۔

آج وہ ایک حسین و معصوم بیٹی کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئی۔ تو گھر پہلے سے زیادہ اپنا لگا۔ پہلے سے زیادہ مضبوط۔

وہ اسے ہاسپٹل لینے آئے تھے۔ اس کا سامان گاڑی میں خود رکھا تھا اور اسے سہ

دے کر گاڑی تک لائے تھے۔ بیٹی کا نام انھوں نے اپنی پسند سے گل رکھا تھا۔ ان کے اس انداز سے اسے بہت سکون محسوس ہوا تھا۔ مگر ان کے اپنے معمولات وہی تھے۔ وہ حقوق جو انھوں نے بیوی کے نام کرنے کا وعدہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر کیا تھا۔ وہ آدھے سے بھی کم اسے ملتے تھے۔ محبتوں اور الفتوں کی بارشیں باہر ہوتی تھیں۔ اس کے حصے میں صرف چھینٹے آتے تھے۔

اور ایک روز وہ آ کر انتہائی درشتگی سے اپنی ٹائی کھینچ کر اتار رہے تھے۔

اس نے مزاج آشنا وفادار بیوی کی طرح سوالیہ نظروں سے انھیں دیکھا۔

''لگتا ہے تمہاری بیٹی سخت منحوس ہے۔ تین سو چونیس میرے لیے ہمیشہ لکی رہا ہے۔ آج ایک لاکھ روپے ہار کر آ رہا ہوں۔ سنا تم نے؟''

''میری ہی بیٹی نہیں۔ آپ کی بھی.....'' اس نے تصحیح کی۔

''ہونہہ!'' انھوں نے کوٹ اُچھال کر ایک طرف پھینکا۔

''یہ تو ایک نیک فال ہے۔'' اس نے سوچا۔

''جو ہارتا چلا جائے تو کیا وہ جوئے، ریس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے؟'' اس نے بے خونی سے سوال کیا۔

''جی نہیں، سڑک کے کنارے کٹورہ لے کر بیٹھ جاتا ہے۔'' وہ بھڑک کر بولے۔

''ضروری ہے کٹورہ لیا جائے۔ ہاتھ پاؤں کی سلامتی کے ساتھ وہ سامان بھی دھو سکتا ہے۔''

''تمہاری تو نیت یہی ہے۔ تمہاری تو اوقات ہی یہی تھی۔''

''چلی جاؤ میرے سامنے سے۔ ورنہ کچھ کر بیٹھوں گا۔'' وہ دھاڑے۔

.....

اس کے دیور اعظم کی شادی ان دنوں ہوئی تھی۔ جب وہ سفر کے قابل نہ تھی۔ ماما فون پر اس کا احوال پوچھتی رہتی تھیں اور ہر مرتبہ اس کے منہ سے سن کر کہ ''خوش ہوں'' ان کے دل سے بوجھ سا سرک جاتا۔ معظم شادی میں شرکت کے لیے دو دن کے لیے گئے تھے۔ ماما کی مرضی سے ہی اعظم کی شادی وہاں مقیم پاکستانی فیملی میں ہوئی تھی۔

گل۔ اب تین سال کی ہو گئی تھی۔ ماما اصرار کر کے اسے امریکہ بلاتی تھیں۔ اس مرتبہ ان کا پروگرام امریکی ریاستوں کی سیر کا تھا۔ وہ اسے شامل کرنا چاہتی تھیں۔

وہ گل کو کے جی کلاسز میں دے چکی تھی۔

تب اعظم اور عظیم کے بھی بے حد اصرار پر معظم نے اُسے جانے کو کہا۔

''ایک دو ہفتے کی بات ہے۔ گل کو یہیں رہنے دو۔ آیا ہے اس کے پاس۔ نانا نانی ہیں، میں ہوں۔''

تب وہ امریکہ چلی آئی۔ ائیر پورٹ پر سب انھیں ریسیو کرنے آئے ہوئے تھے۔ ماما نے اسے گلے لگایا۔ تو اس کا دل بھر آیا۔

''راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' انھوں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ویسے میری تو کمر دکھ رہی ہے بہت لمبا سفر تھا۔'' اس نے تھکی تھکی آواز میں اسے بتایا۔

''اور بھئی، گل نہیں آئی؟'' فرحت نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''انھوں نے آنے ہی نہیں دیا۔ کہہ رہے تھے چند دنوں کی بات ہے تم آرام سے تفریح کر آؤ۔ ڈسٹرب کرے گی تمھیں۔''

''اچھا!'' ماما کی خوشی میں تحیر تھا۔

''اور بھئی، اعظم کی دلہن سے تو تمہارا تعارف نہیں کرایا۔ یہ زہرہ ہے۔'' انھوں نے چھوٹی بہو کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے زہرہ کو گلے لگا کر پیار کیا۔ نازک سی زہرہ بہت پیاری تھی۔ چہرے پر بکھری مسکراہٹ اسکی خوش اخلاقی کی مظہر تھی۔

''اوہ بھابی! گل کا تو اتنا انتظار تھا۔ رات بھیا کا فون آیا تھا۔ انھوں نے بھی نہیں بتایا۔ بس صرف اتنا کہا کہ آپ کو لینے پہلے پہنچ جائیں تاکہ آپ پریشان نہ ہوں۔'' عظیم نے بتایا۔

''ہاں، بھئی، مجھے بھی اس کا بے حد افسوس ہو رہا ہے۔ لے آتیں اسے بھی۔'' ماما نے کہا۔

''ویسے کیسی ہو رہی ہے؟'' انھوں نے محبت سے پوچھا۔

''بہت شرارتی ہے ماما۔ تنگ آ جاتی ہوں۔'' اس نے ہنس کر بتایا۔

پھر وہ ان کے ہمراہ گھر چلی آئی۔ بہت خوبصورت لگا۔ مگر اس کے اپنے گھر سے کم تھا۔ وہ وسیع عریض گھر کہ بچہ اس میں کھو جائے تو بمشکل ملے۔ پانچ بیڈ روم نیچے، سات اُوپر۔ جب ہی وہاں ہو کا عالم تھا۔ اس چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں کس قدر خوشیاں تھیں۔ گل اسے

بہت یاد آئی۔ اور وہ یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ بیڈ پر نیم دراز سوچوں میں گم ماما کے کردار کا تجزیہ کر رہی تھی۔ کیا ماما خود غرض ہیں؟ جنھوں نے اپنے ہر شرعی عیب سے پُر بیٹے کا ناتہ عمر بھر کے لیے مجھ سے جوڑا۔ ہماری کم مائیگی کا فائدہ اٹھایا۔

مجھے اتنی محبت سے بیاہ لائیں۔ ان کی محبت میں آج بھی کمی نہیں۔ وہ اپنے ظلم کا تاوان مسلسل ادا کر رہی ہیں۔ سوچتی ہوں نہ اٹھا کر پٹخا ہوتا ساحل پر۔ موجیں چند لمحے میرے جسم و رُوح سے کھیل کر اسے ہر احساس سے عاری کر دیتیں۔ یوں روز تو نہ جشن مرگ کا اہتمام ہوتا۔ احساس کی دولت ہے کہ روز افزوں بڑھتی جاتی ہے۔ کبھی محبت کرنے والے مل جاتے ہیں۔ تو پھر احساسات توانا ہو جاتے ہیں۔ دل ان سے بدگمان ہوتا ہے۔ تو کوئی احساس گل کے رُوپ میں جھولی میں آن گرتا ہے۔ احساس کی آگ سلگا سلگا کر مجھے جھلسایا جاتا ہے۔ اور تم کیا ہو ہر بات سے بے نیاز محبت کا کوئی بیکراں جذبہ تمہاری روح کو چھوتا تک نہیں۔ تو تم نے کیوں مجھے لہروں سے جیت لیا تھا۔ شاید تمہارے لیے موت بہت بڑا واقعہ ہے۔ تمھارے مشاغل بہت پھیل گئے ہیں۔ تمھیں ہر شغل سے لطف لینے کے لیے ایک عمر نوح چاہیے۔ سو بس تمہاری رُوح میں صرف دو احساس طاقت ور ہیں۔ موت اور زندگی۔ ماسوائے کچھ نہیں۔

اور ماما...... آپ کی محبتوں کا جال اب میرے لیے وبال ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

وہ میرا گھر تھا، وہ میری پہچان تھا۔ وہی میری اصلیت تھی۔ وہ گھر جہاں میں دو بھائیوں، دو سایہ دار اشجار میں ہمہ وقت پھلتی پھولتی تھی۔ میں ان بد دعا دینے والی بزرگ عورتوں کو اپنی کسی خوشی، کسی غم کا بھید بھی نہیں دوں گی۔ میں بوجھ تھی۔ انھیں سکھ کی نیند آئی ہوگی۔

میرے اطراف جتنی عورتیں ہیں۔ آپ ماما، اماں، دادی جان...... سب سے میرا دل میلا ہے۔ تب ہی پردہ سرکا کر ماما...... دودھ کا گلاس لے آئیں۔

''دُلہن پی لو۔''

''میرا جی نہیں چاہتا ماما! بس نیند آ رہی ہے۔''

''تھوڑا سا ہی لے لو۔''

''پھر مجھے زبردستی پینے سے قے ہو جائے گی۔'' یہ وہی دودھ تھا جو میکے میں چھیڑ
ز کا عنوان رہا۔

بہت کچھ بدلا تھا۔ مگر سرکشی کا تھوڑا انداز اب بھی باقی تھا۔ وہ پہلے روز سے آج تک کسی امارت و شان سے مرعوب نہ تھی۔ جیسے یہ اسے یقین تھا کہ یہ سب اسے ملنا تھا۔

وہ آنکھوں پر بازو رکھے انھیں جواب دے رہی تھی۔

وہ سمجھی ماما چلی گئیں۔ اس نے ایک بازو ذرا سا ہٹایا۔ ماما ایک ٹک اس کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔

ماما کی آنکھیں بھی دریا تھیں۔ انھوں نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ وہ آنکھوں پر دوبارہ بازو رکھ چکی تھی۔ تب اسے اپنے پاؤں پر گرم قطروں کا احساس ہوا۔ وہ بے تحاشا چونک گئی۔

ماما اس کے پیروں میں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کے لیے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔

وہ رو رہی تھیں۔

''ماما!'' وہ انھیں شانوں سے تھام کر بٹھاتے ہوئے بولی۔

انھوں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ادھر بھی طغیانی آ گئی۔

''میں تم سے معافی مانگتی ہوں۔'' وہ تڑپ تڑپ کر رونے لگیں۔

''اوہ! ماما!!'' کتنی ہی دیر سمندر جوار بھاٹے کی طغیانی کے سامنے بےبس رہا۔

''مجھے معاف کر دینا۔''

''ماما! یوں نہ کہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں ٹھیک ہوں، خوش ہوں۔''

''اوہ میری بیٹی! ایسے نہ کہا کرو۔ مجھ سے کہو بیٹی! جو تمھارے جی پر بوجھ ہے۔ کہہ دو
بیٹی! تم ہنستی کیوں نہیں؟ کہو بیٹی! جو گزری...... جو میں نے چاہا تھا وہ نظر نہیں آیا...... وہ وہیں
ہے تو پھر تم سراسر گھاٹے میں ہو۔ تم......''

وہ ان کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ان کا خوشبوؤں بھرا وجود اسے
سایہ دار درخت سا لگا۔ پھر کوئی لفظ، کوئی حرف بیچ میں نہ آیا۔ وہ ان کا دامن بھگویا کی اور و
اس کا......''

............❁............

ان کا نیاگرا فال دیکھنے کا پروگرام تھا۔ اور پھر وہیں سے ماما کا اپنے دیور کے پا

ٹورنٹو جانے کا ارادہ تھا۔ وہ دونوں بہوؤں کو اپنے عزیزوں سے ملوانا چاہ رہی تھیں۔

ابھی وہ نیاگرا فال دیکھنے سے جی بھر کر لطف بھی نہ لے پائے تھے کہ شکاگو سے عظیم کا فون آ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ بڑی بھابی..... کو بلائیں۔ آشیانہ نے جب بات کی تو وہ کہہ رہا تھا۔

''بھابی! پاکستان سے بھیا کا فون آیا ہے ابھی..... وہ گل دوسری منزل سے گر گئی ہے اور اب ہاسپٹل میں ہے۔ انھوں نے کہا ہے جتنی جلد ہو سکے آ جائیں۔''

اس کی تو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سب تسلی دے رہے تھے۔ ساری تفریح غارت ہو گئی۔

شکاگو پہنچ کر وہ عظیم کے ہمراہ جلد ہی پاکستان پہنچ گئی۔ ماما نے کہا تھا وہ فرحت کے ہمراہ دو چار روز میں پہنچ رہی ہیں۔

وہ سیدھی گھر جانے کے بجائے ہاسپٹل پہنچی۔ عظیم نے سب کچھ معلوم کر لیا تھا، فون پر۔ اپنی بچی کو نیم مردہ حالت میں دیکھ کر وہ تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ پتہ چلا کہ تین دن سے ہوش نہیں آیا ہے۔ ویسے حالت خطرے سے باہر ہے۔ وہ ایک دم شکستہ حال گھر لوٹ آئی۔ معظم اپنے بیڈ پر لیٹے کوئی فون سن رہے تھے۔

''آپ سے جب اس کا دھیان نہیں رکھا گیا۔ آیا سے نہیں سنبھالا گیا تو کیوں رکھا تھا اُسے اپنے پاس؟'' اس نے فون جھپٹ کر ایک طرف رکھا۔ وہ بالکل جنونی لگ رہی تھی۔

''میری آپ سے کون سی دشمنیاں چل رہی تھیں کہ آپ ہر لمحہ مجھے تاک کر نشانہ لگاتے ہیں۔ جو سیدھا میرے دل میں لگتا ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا..... اسے کچھ ہو گیا۔'' وہ بری طرح رو دی۔

''پاگل ہو رہی ہو تم۔ ٹھیک ہے وہ اب، ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہو۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ تمھیں تو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔'' وہ جو اسے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ اسے اس قدر جنوں میں دیکھ کر جھلا کر رہ گئے۔

اس کے صبح و شام کے چکر تھے۔ دادی جان، اماں رخسانہ باجی، نغمانہ، بھائی سب اس کا خیال رکھ رہے تھے۔ مگر وہ پر کٹی چڑیا کی طرح بے بس پھرا کرتی۔

بچی کے دماغ پر بُرا اثر پڑا تھا اور اس کی آنکھیں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ دماغ کا معاملہ بہت نازک تھا..... آنکھوں سے متعلق ڈاکٹر پُر امید تھے۔

بچی گھر آ گئی۔ بڑی عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگی تھی۔ سارے گھر کے جوتے جمع کر کے ڈھیر لگا دیتی۔ نوکروں کے پاؤں سے بھی سلیپر کھینچ لاتی۔

جمعہ کی صبح وہ اپنے کمرے میں بیٹھی پردوں کے ہک نکال رہی تھی۔ لانڈری بھجوانا تھا اور نئے پردے دیکھ رہی تھی۔ کوئی اُدھڑا ہوا نہ ہو۔ معظم اخبار کا جمعہ ایڈیشن لیے بیٹھے تھے۔ بچی اس کے پاس بیٹھی کھیل رہی تھی۔ یکا یک اپنی آنکھوں پر ہتھیلیاں رکھ کر مسلنے لگی۔ پھر چھوٹے چھوٹے خوبصورت قہقہے لگانے لگی۔ کلکاریاں مارتی ہنستی۔ پھر معظم کے بھاری جوتے اٹھا کر کمرے میں بھاگنے لگی۔ آشیانہ کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے معظم کو دیکھا۔ وہ بھی بڑی پریشانی سے بچی کو دیکھ رہے تھے۔

''کیا ہو گا اس کا؟'' وہ بھرائی آواز میں بولی۔

''ٹھیک ہو جائے گی۔ فکر نہ کرو۔'' وہ تسلی دے رہے تھے۔ مگر آواز میں تشویش تھی۔

تھوڑی دیر میں اماں اور ابا جان آ گئے تو اس کا ذہن اِدھر اُدھر ہو گیا۔

.....

''میڈم۔ بے بی امارا سلیپر اِدھر اُدھر پھینک دیتا اے۔ ام بڑا ڈسٹرب اے۔ میرے کو تو چھٹی دیو۔ یہ ابنارمل بے بی کنٹرول نئیں ہوتا۔''

''اپنے صاحب کو اپنا دُکھڑا سنا دو، وہ بیٹھے ہیں۔'' اس نے بچی کو گود میں اٹھا کر تلخی سے کہا۔

اس نے جانے کیا کہا۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کی تنخواہ تھمائی اور چلتا کیا۔

وہ کسی کام سے کچن میں گئی اور گل نے حسب عادت جوتوں کا ڈھیر لگا دیا۔ تھوڑی دیر بعد جوتوں کو قرینے سے لگایا اور بستر بنا کر لیٹ گئی اور کھلکھلانے لگی۔ معظم نے آ کر دیکھا۔ وہ لمحے بھر کو دم بخود سے کھڑے رہے۔ بعض اوقات ٹھیک ٹھاک لگتی اور بعض اوقات اس قدر تکلیف دہ حرکتیں کرتی جو دونوں کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔

وہ علاج کے لیے باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اس لیے ماما نہیں آئی تھیں۔ عظیم چند دنوں بعد ہی واپس چلا گیا تھا۔

''امی! کہانی سنائیں۔'' ساڑھے تین سالہ گل نے بہت دنوں بعد نارمل انداز میں

بات کی۔ اس نے اسے خوشی سے لپٹا لیا..... ''کون سی کہانی؟''

''کون سی کہانی؟'' اس کو یہ الفاظ بازگشت کی طرح پھیلتے لگے۔

''ملکہ کی؟''

گل خاموش رہی۔ ''کونسی کہانی بیٹی؟''

''وہ کہانی جہاں ایک شہزادی دو بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک دن ایک دیو..... دیو اٹھا کر لے گیا۔ وہ شہزادی آج تک قیدی ہے۔ سنائیں ناں۔''

اس نے اخبار میں سے کہانی شروع کر دی۔ ''نافرمان شہزادہ۔''

''ایک بادشاہ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بادشاہ اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ مگر شہزادہ بہت ضدی اور سرکش تھا۔ وہ کسی کی بات نہیں مانتا تھا۔ ایک دن اسے پتہ چلا۔ کوہ قاف میں کسی دیو کے پاس ایک پھول ہے جس میں ساری دنیا نظر آتی ہے اور اگر وہ پھول کسی کے سامنے کر دیا جائے تو وہ اس پھول کے مالک کا غلام بن جاتا ہے۔ شہزادہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اسے اللہ نے سب کچھ دیا تھا مگر اسے بہت ہوس تھی۔ وہ دنیا کے ہر ملک پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر جب وہ کوہ قاف پہنچا تو پتھر کا ہو گیا کیونکہ وہاں جو بھی آدم زاد آواز نکالتا پتھر کا ہو جاتا تھا۔ بیوقوف شہزادے نے دیو کو آواز دے دی تھی۔ شہزادے کے واپس نہ ہونے پر کچھ خیر خواہ اس کو ڈھونڈنے نکلے۔ انھیں راستے میں ایک بزرگ ملے۔ انھوں نے سنہرا پانی دیا کہ پتھر بنے آدمی پر چھڑکنا وہ زندہ ہو جائے گا۔'' وہ یہیں تک پہنچی تھی کہ معظم اندر داخل ہوئے۔

''تم کیا الٹی سیدھی کہانیاں سنا کر اسے اور زیادہ ذہنی طور پر بیمار کرو گی؟ کبھی عقل بھی استعمال کر لیا کرو۔'' انھوں نے جھاڑا۔

''میرا مقصد تو اسے سُلانا تھا۔'' اس نے سوئی ہوئی گل کو دیکھتے ہوئے کہا۔

.....

وہ دوسرے آپریشن کے بعد ماما کے پاس جانے کی تیاریاں کرنے لگی کیونکہ آپریشن کے نتائج حوصلہ افزا نہیں تھے۔ معظم بھی اس کے ہمراہ جانے کو تیار ہو گئے۔

بچی کی معصوم صورت اور اس کی ابنارمل حرکتیں دونوں کے اعصاب چٹخا دیتی تھیں۔

ان کی رات کی فلائٹ تھی۔ وہ ضروری چیزیں یاد کر کے رکھ رہی تھیں۔ اماں صبح ہی نغمہ کے ہمراہ آ گئی تھیں۔ وہ اس کے ہاں بہت کم آتی تھیں۔ اس داماد کے اور ان کے درمیان

اولین تکلف آج بھی تھا۔ سادہ سی عورت داماد کی پیشانی دیکھ کر بات کرتی تھیں۔ انھیں تو کبھی یہ کہنے کی ہمت بھی نہ ہوئی کہ بیٹا تم ہمارے ہاں کیوں نہیں آتے؟

اس کے سادہ سے گھر والے اس بات پر متفق تھے کہ روپیہ محنت سے کمایا جاتا ہے اور ان کا داماد جتنا دولت مند ہے۔ ظاہر ہے کہ محنت بھی اسی قدر کرتا ہے۔ واقعی مصروف ہے۔

بھائی میاں تو شادی کے بعد بے حد مصروف تھے۔ چھوٹے بھائی ایک سیاسی ماہنامے کے چیف ایڈیٹر تھے۔ ان کی اپنی مصروف دنیا تھی۔ ان کے لیے یہ بات کم تھی کیا کہ ان کی بیٹی نے چار سالوں میں کبھی ان سے کوئی دکھ نہیں کہا جبکہ اس کی دوسری بہنیں سسرال کی دکھی داستانیں ماں کو سنا جاتی تھیں۔

اماں جب سے آئی تھیں نوافل میں مصروف تھیں۔ بچی کو سنبھالے ہوئے تھیں۔ اس پر پڑھ پڑھ کر دم کر رہی تھیں۔ اس نے بچی کا سوٹ کیس لاک کرتے ہوئے نظر اٹھا کر انھیں دیکھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کھڑے بالوں پر اسپرے کر رہے تھے۔ سنجیدہ اور خاموش خاموش۔

اس نے اس دولت مند اور خوبصورت شوہر کو یاسیت سے دیکھا اور سوچا کتنا فکر مند ہے۔ آج یہ شخص اپنی اولاد کی وجہ سے اپنے سو مشاغل چھوڑ کر جا رہا ہے۔ کتنی خوش نصیب ہے میری بیٹی جسے باپ کی توجہ اور ہمدردی تو حاصل ہے۔

اس کو یاد تھا۔ نغمانہ کی شادی پر ابا جی نے اپنے ایک رشتے کے بھائی سے چند ہزار روپے قرض لیے تھے اور چچا نے انھیں دیتے ہوئے کہا تھا۔ بھائی صاحب! آپ تو بہت اہم سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ ہر فائل آپ کے ہاتھوں سے گزر کر آگے جاتی ہے۔ آپ چاہیں تو۔''

''میں جانتا ہوں تمہارا مقصد میاں۔ مگر میں اپنی اولاد کے لیے کنوئیں کھودنا نہیں چاہتا۔ میاں جان لو۔ یہ بات صحیح اور مشاہدے میں آئی ہے۔ جس طرح اولاد ماں باپ کے خون اور جائداد میں حصہ دار ہوتی ہے۔ ان کے گناہ اور ثواب کے نتیجے..... بھی اولاد کے حصے میں آتے ہیں۔ پہلے مجھے ان کاموں سے خوفِ خدا نے روکے رکھا۔ اور اب۔ میاں بچے سکھی رہیں۔ اس سے بڑی دولت کیا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری رقم دو ماہ میں لوٹا دوں گا۔''

اس کا جی چاہا کہ معظم کو جھنجھوڑ کر ابا جی کی یہ بات سنائے۔ اور کہے۔ ''کیسے دوست ہو؟ کیسے دشمن ہو؟''

اسی دم اس کی بیٹی اندر آ گئی اور معظم کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ وہ اپنی آنکھوں کو عجیب سے انداز میں حرکت دے رہی تھی۔ حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہی تھی۔ بجائے معظم نے اسے گود میں اٹھالیا۔ مگر وہ مچل کر ان کی گود سے اتر گئی۔ اور کمرے میں بھاگتے ہوئے چیخنے لگی۔ اس نے معظم کی سمت دیکھا۔ وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ ایک لحظہ کو ان کی نظریں ٹکرائیں۔ ہر دو طرف..... بے چارگی تھی۔

.....۞.....

وہاں جاتے ہوئے بچی کے کئی ٹیسٹ ہوئے۔ رپورٹیں خوش آئند تھیں۔ دماغ کی شدید چوٹ کی وجہ سے بچی کی آنکھوں پر بھی اثر تھا۔ اچانک اندھیرا چھا جانے کی وجہ سے وہ چیختی تھی اور اِدھر اُدھر بھاگتی تھی۔

اسے معظم پر اس وقت ٹوٹ کر پیار آ جاتا جب وہ انتہائی سنجیدگی اور تشویش سے ڈاکٹروں سے انتہائی شستہ انگریزی میں معلومات حاصل کر رہے ہوتے۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ وہی معظم ہے جس نے اس پر تشدد کر کے کبھی معذرت نہیں کی تھی۔

آج اس کی زندگی کا ایک کڑا امتحان تھا۔ نیا آر یا پار۔ بال برابر قوت برداشت کا پل صراط۔ بچی تو ہاسپٹل میں تھی۔ آج اس کا آپریشن تھا۔ وہ ماں اور معظم کے ہمراہ جا رہی تھی۔ اس کا دل دھڑ دھڑ بج رہا تھا۔ صبح کو وہ معظم کے گلے لگ کر بے ساختہ رو دی تھی۔ اور انھوں نے احمق..... بے وقوف کہہ کر ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ اس کی پشت تھپتھپا کر گویا تسلی دی تھی۔

شام چار بجے انھوں نے جانا تھا۔ وہ ظہر کی نماز کے لیے وضو کر کے کمرے میں آئی تو پردہ ہٹاتے ہی اس کے حواسوں پر گویا پھول برس پڑے۔

معظم خوبصورت مخملی جائے نماز پر رکوع کی حالت میں تھے۔

اور وہ دم سادھے انھیں دیکھتی رہ گئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔

آج یہ شخص دنیا کا خوبصورت ترین انسان لگ رہا تھا۔ اسے بیٹی کو سنائی ہوئی کہانی ''نافرمان شہزادہ'' یاد آ گئی۔

اس نے سوچا۔ ''ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ ناممکن کیا بات ہے یہاں؟

بعض اوقات اپنے نفس کا لاڈلا انسان ہوس مال و جاہ میں اتنا مدہوش ہو جاتا ہے کہ اس کی ہوس بند توڑتے سیلاب کو مات کر دیتی ہے اور وہ دنیا میں کسی اور تکبر میں مبتلا کر دینے

والے عیش کے پھول کی تلاش میں گناہوں کے کوہِ قاف میں نکل کھڑا ہوتا ہے۔

اور ایسے میں مرشدوں کا والی..... بزرگوں کا بزرگ..... سارے جہاں کا بادشاہ۔ ایک دھچکے کا، ایک ٹھوکر کا، ایک رُوح کو جھنجھوڑنے والے حادثے کا سنہرا پانی عطا فرماتا ہے۔ جو اس کے تعمیر کے پتھر کو زندگی عطا کر دیتا ہے اور وہ حسب توفیق تائب ہو جاتا ہے اور اپنے ضمیر کے زندہ وجود کو سمیٹ کر اس گناہوں کے کوہِ قاف سے سرپٹ بھاگتا ہے۔ کیسے نصیب والے ہوتے ہیں جنھیں یہ سنہرا پانی دیا جاتا ہے۔

بڑی کڑی قیمت، بڑے کالے کوس کے فاصلے، بڑی مسافتیں، اس سنہرے پانی میں بہت ہے آقا..... کافی ہے مالک..... بھرپور ہے بادشاہ۔

خدا کرے کسی کی ایسی آزمائش نہ ہو کہ اس سنہرے پانی کی نوبت آئے۔

معظم آنکھیں بند کیے آیت کریمہ پڑھ رہے تھے۔

''اور کوئی نہیں سوائے اللہ کے۔ تو پاک ہے بے شک میں ہی اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہوں۔''

اس نے چادر لپیٹی اور جائے نماز معظم کے ساتھ بچھالی۔

اماں کی کم عقل بیٹی جانے کتنے ادراک کے دروازوں سے گزر کر خدائے لازوال کے حضور سربستجو تھی۔

.....۞.....۞.....۞.....